بلیٰ من اسلم وجهه لله وهو محسن فله اجره عند ربه ولا خوف علیهم ولا هم یحزنون

سلسلہ خطباتِ غربیہ (۱)

مسجد ووکنگ کے ابتدائی خطبات

بتفصیل ذیل

(۱) میری مرضی نہیں بلکہ تیری مرضی۔ (۲) خدا کی کامل تصویر۔ (۳) اسلام ہی بپتسمۂ آتشین ہے۔ (۴) الہام ایک فیض ربوبیت ہے

یہ وہ چار خطبے ہیں جن کے ذریعہ اسلام سے قطعی ناآشنا اہلِ انگلستان کو اسلام سے معروف کر لیا گیا۔ اور انھیں چار خطبات سے جو قریباً یکے بعد دیگرے ہوئے مسجد ووکنگ بعض غیر مسلم سکان ووکنگ کیلئے بھی مستقل معبد بن گئی۔ اور انھوں نے اپنے گرجاؤں کو چھوڑ کر مسجد میں آنا شروع کر دیا

از

خواجہ کمال الدین بی اے ایل ایل بی مسلم مشنری ووکنگ (لنڈن)

مطبوعہ یونین سٹیم پریس لاہور میں چھپکر شائع ہوا

قیمت فی جلد (۵/) تعداد (۱۰۰۰)

قیمت فی خطبہ صرف ۵/

خطباتِ غربیہ

محصول ڈاک بذمہ خریدار ہوگا

مصنفہ

جناب خواجہ کمال الدین صاحب بی اے ایل ایل بی مسلم مشنری اڈیٹر اسلامک ریویو

مجریہ ووکنگ لنڈن - یہ وہ معرکتہ الآرا خطبے ہیں - جو جناب خواجہ کمال الدین صاحب نے اپنے قیام لنڈن میں ناآشنایان اسلام کو اسلام سے معرف کرانے اور ان پر حقانیت اسلام محقق کرنے کیلئے انگلستان - فرانس اور سکاٹ لینڈ کے مختلف مقامات پر خطبے لیکچر اور تقریروں کی شکل میں دئے - اس کے پڑھنے سے ہر ایک شخص نہ صرف اسلام کی خوبیوں اور اُس کے اصولوں سے واقف ہو جاتا ہے بلکہ دیگر مذاہب کے مقابل سے اسلام کی افضلیت کا قایل ہونا پڑتا ہے - ان خطبوں میں سے چند خطبات ہم نے بعض احباب کی بار بار فرمائش پر اردو میں ترجمہ کرائے ہیں - ان خطبات کے مضامین کے لحاظ سے انہیں چھ جلدوں میں حسب ذیل نام پر ترتیب دیا ہے -

(۱) سلسلہ خطبات غربیہ نمبر ۱ - موسوم بہ مسجد ووکنگ کے ابتدائی خطبات -

(۲) سلسلہ خطبات غربیہ نمبر ۲ - موسوم بہ توحید الٰہی - دعا - تصوف -

(۳) سلسلہ خطبات غربیہ نمبر ۳ - موسوم بہ خطبات عیدین -

(۴) سلسلہ خطبات غربیہ نمبر ۴ - موسوم بہ دہریوں اور ملحدین کو خطاب -

(۵) سلسلہ خطبات غربیہ نمبر ۵ - موسوم بہ اسلام اور دیگر مذاہب -

(۶) سلسلہ خطبات غربیہ نمبر ۶ - موسوم بہ - حقوق نسواں -

نوٹ - آئندہ انشاء اللہ یہ سلسلہ جاری رہیگا مسلسل خطبات اردو میں شائع ہوتے رہینگے جو احباب مستقل طور پر اسکے خریدار ہونا چاہیں - ازراہ کرم بذریعہ کارڈ مطلع فرماویں - تاکہ جب کبھی اس سلسلہ میں کوئی نیا خطبہ شائع ہو تو اُن کی خدمت میں ارسال کر دیا جاوے -

المشتہر

مینجر اشاعت اسلام بک ڈپو عزیز منزل نولکھا لاہور

میری مرضی نہیں بلکہ تیری مرضی۔

یہ خطبہ سب سے پہلا خطبہ ہے جس سے خطبات دوکنگ کا آغاز ہوتا ہے۔ کثرت سے لوگ اُس وقت اسلام سے نا آشنا تھے۔ دراصل اس خطبہ میں ہمارے مسلم مشنری نے عیسائی دنیا کو جو اسلام کے نام تک سے بھی ناواقف تھے۔ اسلام سے معرّف کرانا چاہا ہے۔ یہ ہی خطبہ پھر لندسی ہال میں دوسرے جمعہ پر بطور خطبہ جمعہ پڑھا گیا۔ یہاں خطیب نے اپنے خطبہ کے لیئے جناب مسیح کا ایک فقرہ انتخاب کیا ہے جو مصیبت کے وقت آپ کے مُنہ سے نکلا۔ اور اس سے ان کا یہ مطلب تھا کہ میری مرضی کوئی چیز نہیں بلکہ وہی ہو جو تیری رضا ہو۔ یعنے انسان کی مرضی رضائے الٰہی کے ماتحت ہونی چاہیئے ۔ مرتب

"میری مرضی نہیں بلکہ تیری مرضی" یہ مختصر سا فقرہ کیسا جامع کیسا خوبصورت صداقت اور حکمت سے بھرا ہوُا اور حق پوچھو تو یہی ایک فقرہ نشیب و فراز زندگی میں ہر مرحلہ پر انسان کے لیئے مشعلِ راہ ہو جاتا ہے۔ اور عجب بات ہے کہ یہی ایک فقرہ جامع طریق پر اس حقیقت کو ظاہر کرتا ہے جو لفظ اسلام میں مظہر ہے۔ اسلام کیا ہے۔ رضا الٰہی کے آگے سر جھکا دینا انسانی ارادہ یا انسانی مرضی وہ زبردست قالب ہے۔ کہ جس میں ہر انسانی فعل اور سیرت ڈھل جاتی ہے لیکن یہ ارادہ بالضرور انسان کو تباہی تک پہنچا دے گا۔ اگر یہ خلیج الرسن ہو۔

فی الواقعہ انسانی ارادہ تہذیب و تعدیل کا محتاج ہے اور ہر وقت اصلاح و تربیت چاہتا ہے اور اگر انسان رضاء الٰہی کو ہی پورا کرنے آیا تو پھر یہ زرین قاعدہ زندگی جو جناب مسیح نے فرمایا اُس کی اہمیت ظاہر ہے۔ اس خدائے قدوس کی رضا ہی انسانی رضاء پر غالب آنی چاہیئے۔ اس اصول کو جناب مسیح نے صلیب سے سکھایا۔ اپنی جان کی قربانی سے آپ نے ہمیں تعلیم دی۔ اب اگر یہی اصول ایک صحیح اصوؔل ہے۔ تو ہمیں رضاء الٰہی کا علم ہونا از بس ضروری ہے کیا اس رضاء الٰہی کو ہم مختلف مصائب اور تکالیف میں پڑ کر حاصل کریں۔ جیسے کہ فرقہ پوزیٹوسٹ Positivist ہمیں تعلیم دیتا ہے یا اس رضاء الٰہی کا مطالعہ ہم عقیدہ کے مطابق مطالعہ فطرت سے کریں۔ اس کا تو یہ مطلب ہے کہ ہم حکمتِ الٰہی کو دوسروں کے نقصان پر حاصل کریں۔ انسان کی نسلوں کی نسلیں جہالت اور ناواقفی کے باعث طرح طرح کے نقصان اُٹھائیں اور اس طرح تکالیف نقصانات اٹھا کر ہماری ہدایت کے لیئے سبق چھوڑ جاویں۔ کیا یہ خود غرضی نہیں اور خدائے تعالےٰ کی ربوبیت پر ایک خطرناک حملہ نہیں۔ یہ باتیں ممکن ہے اُن کو پسند آئیں۔ جو رگ دہریت اپنے اندر رکھتے ہیں۔ لیکن جب ہم ایک دفعہ تسلیم کرلیں کہ ایک حکیم و فہیم خدا ہمارے چاروں طرف حکومت کر رہا ہے۔ وہ حکیم اور مدبر بالارادہ خدا ہے جس کے علم میں کوئی خاص منشاء انسان کے پیدا کرنے میں ہے جس کو وہ پورا کرنا چاہتا ہے۔ اب اگر ہم یہ یقین کرلیں تو ہمیں اس منشاء الٰہی کا علم بھی ہونا چاہیئے اور ان راہوں کا بھی علم ہونا چاہیئے جس سے وہ مشیت پوری ہوتی ہے اور مذہب کی اگر کوئی غرض ہو سکتی ہے تو یہی ہے۔ مذہب دنیا میں اسی لیئے آیا کہ وہ ہم پر ہمارے خالق

کی منشا ظاہر کرے کہ میں اس نے کیوں کیا ایک اور اِس طرح ہم اس کی غرض پوری کرنے کے لیے اپنی رضا کو اس کی رضا کے ماتحت کر دیتے ہیں۔ علاوہ ازیں جس طرح ہمارے حالات واقعہ ہوئے ہیں۔ ہر وقت ہم ایک نہ ایک مرضی کے تابع ہوتے ہیں۔ خواہ وُہ ہماری مرضی ہو یا کسی کی مرضی ہو ہم روزمرہ کی زندگی میں ایک ایسی منشا اور رضا کے ماتحت ہو جاتے ہیں جس کو ہمارے رسم و رواج نے ہم میں معرُوف کا رنگ دے دیا۔ مرضی کی ہم نے پیروی کرنی ہے۔ اور جب یہ حالت ہے تو کیوں نہ اُس اعلےٰ وارفع مرضی کے ماتحت لے آویں جس کی کوئی نہ کوئی مرضی ہمارے پیدا کرنے میں تھی۔ اور جس مرضی کو صرف وہی جانتا ہے اور وہی جانتا ہے کہ وُہ مرضی کس طرح پیدا ہو گی۔

جیساکہ میں نے ابھی کہا ہے۔ کہ مذہب جو دُنیا میں نازل ہُوا۔ تو اسی ربانی مرضی کو انسان پر ظاہر کرنے کے لیئے پیدا ہُوا۔ اِس لیئے مذہب خدا کی طرف سے ہر ایک کو بلا تمیز قوم ہر وقت دیا گیا۔ دُوسری طرف یہ بھی عام طور پر تسلیم کیا گیا ہے۔ کہ یہ ساری کتب الٰہیہ جن میں خدا کی منشاء ظاہر ہوئی تھی اپنی اصلی شکل و صوُرت میں نہیں رہیں۔ ہاں قرآن کے متعلق کہا جاتا ہے۔ کہ یہ اپنی اصلی شکل و صورت میں ہے۔ لیکن اِس بات کو بھی جانے دو۔ جس شکل میں کوئی کتاب الٰہی ہے۔ اس کو اُٹھا لو۔ سوال یہ ہے کہ کیا یہ مروجہ کتب مقدسہ رضا الٰہی کا آئینہ ہو سکتی ہیں۔ سب سے پہلے آؤ ان چار اناجیل کو لے لو۔

آج کے ہمارے خطبہ کا جو موضوع ہے یعنی یہ میری رضا نہیں بلکہ تیری رضا بلا یہ تو اِس قدر عظیم الشان ہے کہ اس کی تعلیم مسیح نے پھانسی پر چڑھا کر دی۔

ہم آپ کی زندگی میں اور آپ کے مقدس الفاظ میں تعلیم دیئے جاتے ہیں کہ خداوند تعالےٰ ہم سے کیا چاہتا ہے۔ جب ہمیں دشمنوں سے معاملہ پڑے۔ ہمیں کس طرح صبر کے ساتھ مصائب زندگی کو سہنا اور کسی تکلیف کی بھی ہمیں پرواہ کرنی چاہئیے اگر دشمنانِ خدا کی پردہ دری کرنے میں ہمیں اُٹھانی پڑے۔ لیکن یہی چند باتیں ہماری کل زندگی پر حاوی ہیں یا ہماری کل ضروریات زندگی ہمارے کاروبار اور ہمارے معاملات ان حدود سے باہر بھی چلے جاتے ہیں۔ جن کو مسیح کے پیارے الفاظ گھیرے ہوئے ہیں۔ کیا ہمیں ہر معاملہ زندگی میں ربّانی روشنی کی ضرورت نہیں۔ اور تو اور اپنے اعضاء جوارح کو دیکھ لو۔ خدا نے ہمیں ہاتھ دیئے۔ پاؤں دیئے۔ آنکھیں دیں۔ دل و دماغ دیا۔ ان چیزوں کے بنانے میں کوئی منشاء ایزدی ہوگی۔ ان کا کوئی خاص استعمال اُس کی نگاہ میں ہوگا۔ کیونکہ ہم ہر روز دیکھتے ہیں کہ انہی اعضاء و جوارح کی بد استعمالی ہمیں ہلاکت کا مُنہ دکھلاتی ہے کیا انہی اعضاء جوارح و دیگر اعضاء کے ناجائز استعمال کے لیئے ہم خدا اور مخلوق خدا کے سامنے ذمہ وار نہیں۔ دیکھو اسی ذمہ داری کی طرف کس خوبصورتی سے کتاب اسلام نے اشارہ کیا۔ یہ ہیں قرآن کریم کے الفاظ:- ولا تقف ما لیس لک بہ علم ان السمع والبصر والفواد کل اولٰئک کان عنہ مسئولا - بنی اسرائیل آیت ۳۶

ترجمہ۔ اس بات پر مت چل جس کا تجھے علم نہیں۔ کیونکہ تجھ سے تیرے دیکھنے سننے اور دل کے متعلق پوچھا جاوے گا۔

کیسی حکمت اور صداقت سے بھری ہوئی یہ نصیحت ہے خدا کی کتاب میں یہاں صرف

تین اعضاء کا ذکر کیا ہے۔ لیکن یہی تین اعضاء وہ زبردست اعضاء ہیں کہ جن کے زیر اثر
تمام انسانی ارادے اور خواہشات مختلف شکلیں اختیار کرتی ہیں۔ دراصل یہ تین اعضاء
کل حواس انسانی کے قائم مقام ہیں۔ ہمارے علم کا زیادہ حصہ آنکھ اور کان کے ذریعہ
ہمیں ملتا ہے۔ اور ہمارا قلب ہمارے ارادہ و مرضی کا سرچشمہ ہے "میری مرضی نہیں بلکہ
تیری مرضی" کیسا پیارا فقرہ ہے۔ **کیسی بر محل نصیحت کیسی بر موقع ہدایت ہے**
لیکن سوال تو یہ ہے کہ آنکھ کان اور دل کے استعمال میں تیری مرضی کا علم کہاں سے
ہو۔ کیونکہ آنکھ اور کان سے میں واقعات کا علم حاصل کرتا ہوں۔ اور دل کے ذریعہ
ان پر محاکمہ کر کے اپنی مرضی اور ارادے کو استعمال کرتا ہوں۔ مجھ سے کہا جاتا ہے۔ کہ
میں اپنے تمام امور زندگی میں ہادی راہ "تیری مرضی" رکھوں۔ اور اپنی مرضی کو تیری
مرضی کے ماتحت کردوں۔ لیکن کوئی ذریعہ نہیں کہ جس سے مجھے تیری مرضی کا علم ہو۔ ہم
آپس کے معاملات زندگی میں بھی ایک دوسرے کے بالمقابل فرائض و ذمہ داریاں رکھ کے
توڑنے سے دنیا میں بدی پیدا ہو جاتی ہے۔ اور ہماری ربانی غرض جو انسان کے
بنانے میں تھی مفقود ہو جاتی ہے۔ کس طرح سے اس حکم "تیری مرضی" کو میں ان مختلف
فرائض و ذمہ داریوں کے ادا کرنے میں پورا کروں۔ کیا میں اپنی زندگی کے ایک ایک
قدم پر اندھیرے میں نہیں۔ کیا مجھے ہر مرحلہ زندگی پر روشنی کی ضرورت نہیں پھر اگر
روشنی کی ہی ضرورت ہے۔ تو کیوں ربانی روشنی نہ ہو۔ مذہب دنیا میں اکثر بھی ہوتے رہے
ہیں اور ہر ایک اسی ربانی روشنی کو اپنے اندر رکھنے کا مدعی ہے۔ لیکن میرے نزدیک

کوئی بھی کتاب خاتم الہام الٰہی ہونے کی مدعی نہیں ہوسکتی۔ جب تک اس میں ذیل کے امور نہ ہوں جس کا دعوے اسلام کی کتاب قرآن نے کیا۔ اور ان امور کو اپنے اندر رکھا۔ جس کا دعوے کیا (الف) ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ فِيْهِ هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ ۝

اس کتاب میں کوئی شبہ نہیں، یہ حق اللہ و حق العباد کا لحاظ رکھنے والوں کے لیئے ہدایت نامہ ہے (سورہ بقرہ اول آیت) كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ اِلَيْكَ لِتُخْرِجَ النَّاسَ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ بِاِذْنِ رَبِّهِمْ اِلٰى صِرَاطِ الْعَزِيْزِ الْحَمِيْدِ ۝ یہ قرآن ایک اعلےٰ درجہ کی کتاب ہے۔ اس کو ہم نے تم پر اس غرض کے لیئے اُتارا ہے کہ تم لوگوں کو اُن کے پروردگار کے حکم سے (کفر کے) اندھیروں سے م

اِس قسم کی بہت سی آیتیں قرآن کریم میں ہیں۔ جن سے ہمارے روزمرہ معاملات زندگی میں اس چیز کا پتہ لگتا ہے جس کو جناب مسیح نے ”**تیری مرضی**“ کہکر پکارا +

موجودہ کلیسیا عملاً اپنے اُستاد کے خلاف ہے۔ لیکن مسیحی کلیسیا جسکا ڈھانچ پولُس نے بدل دیا۔ وہ دراصل سکھلاتا ہے کہ **تیری مرضی** دریافت کرنے کی ضرورت نہیں۔ اِس کی تعلیم بالکل اس کے برعکس ہے۔ **تیری مرضی** جس سے مراد وہ ربانی قوانین یا شرائع ہیں۔ جن پر چلنا انسان کے لیئے ضروری تھا۔ اور جن کے ماتحت انسانی مرضی کو رہنا تھا اُن پر پولوس کی تعلیم کے ماتحت اِنسان چل سکتا ہی نہیں۔ گناہ جس سے مراد **تیری مرضی** کا خلاف ہے۔ حسب تعلیم پولوس **تیری مرضی** یعنے شریعت انسان کی فطرت میں آچکا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ انسان قوانین الٰہی پر چلسکتا ہی نہیں۔ **تیری مرضی** یعنے شریعت بقول پالوس لعنت ہے۔ اور لعنت کیطرف لیجاتا ہے اسلیئے ہم **تیری مرضی** یعنی شریعت پر چل کر نجات پا ہی نہیں سکتے اور اس لیئے ہمیں نجات مسیح کے خون کے ذریعے حاصل ہوئی۔ کیا عجیب انکشاف حقیقت جناب پولوس

(الی النور) (سورہ ابراہیم آیت پہلی)۔ (ج) سُوْرَةٌ اَنْزَلْنٰهَا وَفَرَضْنٰهَا وَاَنْزَلْنَا فِيْهَآ اٰيٰتٍۭ بَيِّنٰتٍ لَّعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ (یہ ایک سورت ہے۔ جس کو ہم نے اُتارا اور یہ دستور العمل ہمارا ہی باندھا ہوا ہے

کو ہوا۔ اور یہ وہ انکشاف ہے جس کا پتہ جناب مسیح کو نہیں چلا۔ اگر مسیح بھی اس حقیقت سے آشنا ہوتا تو پھر وہ کیوں یہ سبق سکھلاتا۔

"میری مرضی نہیں بلکہ تیری مرضی"

اگر وہ جانتا تھا۔ کہ ہم تو اُس کی مرضی پر چل بھی نہیں سکتے تو پھر وہ ہمیں یہ سبق کیوں دیتا۔ پولوس اور اُس کے ماتحت عیسائی کہتے ہیں کہ وہ خدا ہے۔ لیکن جب وہ یہ سبق دینے میں انسانی فطرت کو نہ سمجھ سکا۔ پھر وہ خالق کس طرح ہو سکتا ہے۔

خدا کی کامل تصویر

طرز بیان اور الفاظ خواہ مختلف ہوں۔ لیکن دُنیا میں شاید ہی کوئی ایسا مذہب ہوگا۔ جس نے اس کھلی کھلی صداقت کی تعلیم نہ دی ہو۔ کہ انسان اپنے خالق (خدا تعالیٰ) کی صورت پر پیدا کیا گیا تھا۔ کیا شک ہے۔ کہ حضرت انسان میں حیرت انگیز استعدادیں رکھی گئی ہیں۔ بعض وجودوں میں وہ کھلے طور پر جلوہ آرا ہوتی ہیں لیکن اکثر میں مخفی ہی رہتی ہیں۔ اور اُن کو عالم شہود کا دیکھنا نصیب نہیں ہوتا ہے۔ مگر اس میں کچھ کلام نہیں۔ کہ ہم میں سے ہر ایک اُس بالا و برتر ہستی کا ظل ہے وہ ضرور ہے۔ کہ ہم میں وائرہ انسانی کے اندر تمام صفات خداوندی موجود ہوں خواہ اُن کا وجود امکانی طور پر ہی کیوں نہ ہو۔ کوئی بھی جس کو جامۂ انسانی عطا ہوا ہے

ان صفات سے محروم نہیں رکھا گیا۔ اسلام کے مقدس بانی ؐ کے پاک لبوں سے اس ظل کی حقیقت حسب ذیل پُرحکمت الفاظ میں ظاہر ہوتی ہے۔ حدیث شریف میں آنحضرت صلعم کی وحی خفی یوں مندرج ہے۔ "جس شخص سے میں محبت کرتا ہوں میں اس کے کان بنجاتا ہوں جس سے وہ سنتا ہے۔ اور میں اس کی آنکھ بنجاتا ہوں جس سے وہ دیکھتا ہے۔ اور میں اس کے ہاتھ بنتا ہوں جن سے وہ پکڑتا ہے۔ اور میں اس کے پاؤں بنتا ہوں جن سے وہ چلتا ہے۔" پھر جناب رسالتمآبؐ نے اس اعلیٰ درجہ پر پہنچنے کا طریقہ حسب ذیل الفاظ میں بیان فرمایا ہے :-

کہ خدا فرماتا ہے "اے انسان تو میرے احکام کی پیروی کر اور میرے جیسا ہو جائیگا" اور تب تو کہے گا "ہو جا" تو "ہو جائیگا" خدا کے احکام کی پیروی خدا کی رضا اور جوڑ کے حصول کی شاہراہ ہے۔ الفاظ "کن فیکون" میں کوئی امر خلاف قانون قدرت نہیں ہے اگر ایک شخص اس عالم کا ہمنوار ہو کر قانونِ قدرت کے ساتھ مطابقت حاصل کرے تو اس کی خواہش مشیت ایزدی کے ساتھ مل جاتی ہے اور جو کچھ ایسا شخص چاہتا ہے ہو جاتا ہے۔ خدا کے احکام کی پیروی ہی آسمانی خزانہ کی کلید ہے۔ اور اس خزانہ کو حاصل کر کے انسان خدا تعالیٰ کا حقیقی عکس ہو جاتا ہے۔ بے شک یہ راہ دشوار گذار ضرور ہے۔ لیکن امکان سے باہر نہیں ہے۔ اگر ہم خدا تعالیٰ کی شکل پر بنائے گئے ہیں۔ تو خدائی صفات ہمارے وجودوں سے منعکس ہو سکتی ہیں۔ روحانیت کا یہ اعلےٰ درجہ محمدؐ۔ موسےٰؑ۔ عیسےٰؑ۔ کرشن اور دیگر خدا کے تابعدار اور متبرک بندوں نے

کم وبیش حاصل کیا۔ اور اُس کے حصُول کا رستہ ہمیشہ ایسے وجُودوں کے لیے جو خدائی احکام پر چلیں گے اور دوسروں کو وہ احکام سکھائیں گے۔ کھلا رہے گا۔ یہی کمال کی حالت تھی جس نے یسُوع مسیح سے یہ الفاظ کہلوائے "میں باپ سے آیا ہوں۔ جو کوئی مجھ پر ایمان لائے گا۔ اگرچہ وہ مُردہ ہو زندہ کیا جائے گا"۔ جناب کرشن اس سے بھی آگے چلے گئے۔ اور کہا "میں بھگوان ہوں"۔ اور پھر کہا کہ "جو میری خدمت کرے گا اس کو پُورا اجر ملے گا۔ اور میں اس واسطے آیا ہوں کہ انسانی قربانیاں بحیثیت خدا ہونے کے قبول کروں نہ بحیثیت پروہت ہونے کے"۔ جناب محمدؐ نے ایک ہزار اہلِ مکہ کی آنکھوں میں مُٹھی بھر کنکر اور ریت پھینکی۔ اور اِس سے دشمنوں کی صفوں میں ایسی گھبراہٹ طاری ہوئی۔ کہ سوائے بھاگنے کے کچھ بن نہ پڑی۔ اور وہ جو آنجنابؐ اور اُن کے متّبعین کی جان لینے کی ٹھان کر آئے تھے۔ نہایت شرمناک شکست کا منہ دیکھ کر اُلٹے پاؤں دوڑ گئے۔ اس واقعہ کی طرف قرآن کریم میں خدا تعالیٰ نے یُوں اشارہ فرمایا ہے :۔ وَمَا رَمَيْتَ إِذْ رَمَيْتَ وَلَٰكِنَّ اللَّهَ رَمَىٰ ۔ اِس موقعہ پر جناب محمدؐ کا داہنا ہاتھ گویا خدا کا ہاتھ تھا۔ قرآن کریم میں ایک اور آیت ہے جو اس مطلب کو اور بھی پُر معنی الفاظ میں ظاہر کرتی ہے۔ اور وُہ یہ ہے "قُلْ إِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّونَ اللَّهَ فَاتَّبِعُونِي يُحْبِبْكُمُ اللَّهُ۔ یعنی اے نبی تو لوگوں کو کہہ دے کہ اگر وہ خدا کے محبوب بننا چاہتے ہیں۔ تو وہ تیری متابعت کر کے یہ درجہ حاصل کر سکتے ہیں۔ اور یہ ظاہر ہے کہ جو خدا کا محبُوب ہے۔ اُس کے اعضا، خدا کے اعضا ہیں۔ جو شخص جناب محمدؐ کی پیری

کرتا ہے۔ وہ خدا تعالےٰ کا کامل شبیہہ بنجاتا ہے۔ کیونکہ آنجناب خدا تعالیٰ کے تمام احکام کی پُوری پُوری متابعت کرتے ہیں۔ اس سے ظاہر ہے کہ خدا تعالیٰ کے احکام پر چلنے سے ہی انسانیت کا یہ اعلےٰ درجہ حاصل ہوتا ہے ۔

تعجّب اور حیرت کی انتہا نہیں رہتی ہے جب ہم دیکھتے ہیں کہ ایک شخص کے مُنہ کے چند الفاظ کو مغربی دماغ اس کی خدائی کے ثبوت میں قبول کرلیتا ہے لیکن اسی قسم کے الفاظ جب کسی دوسرے شخص کی طرف منسوب ہوتے ہیں۔ تو اُن کا انکار کرتا ہے۔ جس طرح کے الفاظ یسُوعؑ نے کہے۔ ویسے ہی بلکہ بعض صورتوں میں اُن سے بھی پُرزور الفاظ دیگر مقدّس انسانوں کے بھی پاک لبوں سے نکلے ہیں۔ پھر اس میں کیا راز ہے کہ ایک کو تو خدائی تخت پر بٹھا یا گیا۔ اور دُوسروں کو انسانیت کے درجہ کے اُوپر ترقی نہ ملی یسوعؑ کے معجزات کی فہرست میں ایک بھی ایسا نہیں ہے جس کی نظیر دوسرے پیغمبروں کے معجزات میں نہ ملے۔ پھر حیرانی ہے کہ ایک تو ایک کام کی وجہ سے خدا بنایا گیا۔ اور دوسرے باوجود اسی قسم کا کام کرنے کے انسان ہی رہے۔ بظاہر یہ ایک مشکل معمہ معلوم ہوتا ہے مگر ذرا غور کرنے سے یہ حل ہو جاتا ہے۔ یسُوع مشرق کا باشندہ تھا۔ اور اس کا کلام مشرقی طرز میں تھا۔ اور مغربی دماغ کے لیئے مشرقی طرز کا کلام سمجھنا بہت ہی مشکل ہے۔ اور یہی امر ٹھوکر کا باعث ہؤا۔ ہمیں تو یسُوع کے کلام میں کوئی ایسی بات معلوم نہیں ہوتی ہے جس سے کسی قسم کی حیرت ہو۔ مشرق کے دیگر بڑے بڑے انسانوں نے ویسے ہی الفاظ کہے ہیں اور یسوعؑ کے ان الفاظ میں جو اس نے اپنا تعلّق خدا تعالیٰ

سے ظاہر کرنے کے لیئے استعمال کیئے ہیں۔ کوئی امر خلاف معمول نہیں ہے بعض اور بھی وجود ہیں کہ جن کو ایسی ہی غلط فہمی کی وجہ سے خدائی کا مرتبہ دیا گیا تھا۔ مگر اسلام (اس کے مقدس بانی پر ہزار ہزار صلوٰۃ ہو) پھر اُن کو خدائی کے جعلی تخت سے جس کی خواہش یسوع کی طرح اُن کے خیال میں بھی نہ آئی تھی۔ اُتار لایا ہے۔ اور وُہ وقت قریب ہے۔ کہ یسوع کو بھی دُنیا اس کی اصلی حالت میں دیکھے۔ آفتابِ صداقت طلوع ہونے کو ہے۔ اور موحدانہ تحریک زوروں پر۔ وسیع الخیال عیسائیوں نے عیسائیت کی بے معنی اور ناقابل فہم تھیوریوں کو ظاہر کر دیا ہے۔ اور مسیح کی خدائی اب چند دن کی مہمان ہے۔ بے شک جیسا کہ قرآن کریم بتاتا ہے یسوع ایک بڑا پیغمبر تھا۔ اور معدودے چند بہترین انسانوں میں سے ایک تھا +

اسلام ہی بپتسمۂ آتشین ہے

یہ سرمن علے الخصوص عالی جناب لارڈ ہیڈلے صاحب بالقابہ کی فرمائش پر ماہ مئی ۱۹۱۴ء کی ایک اتوار کو مسجد ووکنگ میں دیا گیا۔ دراصل اس میں انجیل کی ایک آیت کی ایک لطیف تفسیر کی گئی ہے جو بقول لارڈ موصوف عیسائی فاضلانہ الہیات کے لیئے ایک معمہ ہی رہی ہے۔ جو تفسیر اِس خطبہ میں آئیتِ مذکورہ کی ہمارے مسلم مشنری نے کی ہے۔ وہ کثرت سے لوگوں کے لیئے موجب اطمینان

ہوئی ہے۔ ہم سرمن کا ترجمہ ذیل میں دینے سے پہلے چند تمہیدی باتیں یہاں لکھدینا ضروری سمجھتے ہیں جس سے ہر ایک پڑھنے والا اس سرمن کی تلمیحات کو سمجھ سکیگا یہودیوں میں جب بچّہ دینی فرائض کے ادا کرنے کے قابل سمجھا جاتا ہے۔ تو معبد میں لے جاکر جو رسم اُس کے سر پہ پانی ڈال کر ادا کی جاتی ہے۔ اور اُس کے بعد اس بچّہ کو شعار مذہب کا پابند قرار دیا جاتا ہے۔ اس رسم کا نام بپتسمہ ہے۔ یہ رسم قوم کے راہب اور احبار کے سپرد تھی۔ چنانچہ اپنے وقت میں حضرت یحییٰ جن کو عیسائی یُوحنّا اصطباغی کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ اس رسم کو ادا کیا کرتے تھے مسیح کو بھی بپتسمہ اُنھوں نے ہی دیا تھا۔ چنانچہ آیت زیر بحث انجیل میں یوحنّا کی طرف منسوب کی گئی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ میں تو بپتسمہ پانی کے ذریعہ دیتا ہوں۔ لیکن جو میرے بعد آنے والا ہے وہ روح القدس اور آگ سے بپتسمہ دیگا۔ عیسائی اس فقرہ کا مشارٌ الیہ جناب مسیح کو ٹھہراتے ہیں اس فقرہ میں یُوحنّا کا یہ کہنا کہ وہ آنے والا آگ سے بپتسمہ دے گا۔ ہمیشہ عجیب و غریب تشریحات کا موجب ہوا ہے۔ سرمن میں یہ دکھلایا گیا ہے کہ اس آتشین بپتسمہ سے مراد اسلام ہے۔ اور جس مقدّس انسان کیطرف یُوحنّا اشارہ کر رہا ہے۔ وہ شارعِ اسلام ہے*

عیسائیوں میں پانی سے بپتسمہ دینے کی رسم ہر بچّے کی پیدائش پر کیجاتی ہے اور خیال کیا جاتا ہے کہ اس بپتسمہ کے بعد اس میں نئی زندگی پیدا ہو جاتی ہے۔

بلکہ بعض کا تو یہ خیال ہے - کہ اس رسم کے ادا ہو جانے پر انسان میں سے
گناہ کی فطرت ہی مر جاتی ہے - اگرچہ عیسائیوں نے پولوسی تعلیم کے ماتحت
کل رسوم و شرائع تورات کو ترک کر دیا ہے - لیکن بپتسمہ کی رسم نہیں چھوڑ سکتے
اس کی وجہ بھی یہ ہی آیت زیر بحث ہے کیونکہ خیال ہے کہ مسیح کے نام پر
بپتسمہ دینے سے رُوح القدس کا بپتسمہ ہو جاتا ہے - اب ہم ذیل میں سر من
بالفاظہ درج کرتے ہیں: "میں تو تمہیں توبہ کے لیئے پانی سے بپتسمہ دیتا ہوں لیکن جو میرے بعد آتا ہے وہ مجھ سے زور آور ہے میں اس کی جوتیاں اٹھانے کے لائق نہیں - وہ تمہیں رُوح القدس اور آگ سے بپتسمہ دے گا" (متی باب ۳ آیت ۱۱)
پانی کے ساتھ بپتسمہ دینے کی رسم یہودی مذہب سے عیسائیوں کو ملی ہے -
پالوسی تعلیم نے اگرچہ تمام شریعت کو اڑا کر عیسائیوں کو ہر ایک قسم کی بجا آوری
احکام سے نجات دے دی - لیکن تاہم یہ رسم بپتسمہ ان میں قائم رہی لیکن
اگر حسب تعلیم پالوس شریعت ایک لعنت ہے - اور اس پر چلنا ضروری نہیں
تو کیا یہ یہودی رسم بپتسمہ جس کے ذریعہ کسی کو کلیسیا کا ممبر کیا جاتا ہے - ایک
بیہودہ فعل نہیں لیکن اگر یہ مقدس رسم اس نئی زندگی کے لیئے بطور نشان
کے ہے - اور یہ رسم بپتسمہ صرف مذکورہ بالا الفاظ کے پورا کرنے کے لیئے
کی جاتی ہے - اور ایسے ہی مذکورہ بالا الفاظ جناب مسیح کی طرف اشارہ
کرتے ہیں - تو پھر چاہیئے تھا کہ یہ بپتسمہ آگ کے ذریعہ دیا جاتا - نہ کہ پانی کے
ذریعے - یہاں ہم مسئلہ رُوح القدس پر بحث کرنا نہیں چاہتے - اور نہ اس بات
پر کچھ لکھنا چاہتے ہیں - کہ رُوح القدس کے بپتسمہ کی کیا تاثیر ہوا کرتی ہے

کیونکہ خود اس کا وجود غیر محسوس ہے۔ علاوہ ازیں جو اس بات کے مدعی ہوتے ہیں کہ اُنھوں نے رُوح القدس سے بپتسمہ پایا ہے اُن کے اعمال و افعال اِس بات کی تصدیق نہیں کرتے۔ بہرحال یہ سوال ہی ایسا ہے جو مان ہی لینے والا ہے اِس میں عقل کو دخل نہیں۔

کلیسیا کا بپتسمہ رُوح القدس کا بپتسمہ نہیں ہو سکتا

علاوہ ازیں جیسا کہ یوحنّا اصطباغیؑ کے مذکورہ بالا الفاظ سے ظاہر ہوتا ہے کہ رُوح القدس والا بپتسمہ تو آگ کا ہوگا۔ نہ کہ پانی کا۔ اور اسی طرح ہم کتاب اعمال میں پڑھتے ہیں کہ رُوح القدس ایک آگ جیسی زبان میں ظاہر ہُوا لیکن اس آگ کا جس کا ذکر ہم کتاب اعمال باب دوئم میں پاتے ہیں۔ پھر کبھی ظاہر نہ ہونا اور خود مسیح اور اُس کے کلیسیا کا بپتسمہ دینے کے وقت کبھی آگ کو استعمال نہ کرنا۔ اس امر کو ثابت کرتا ہے۔ کہ جس مقدس انسان کی طرف یوحنّا اصطباغی نے اشارہ کیا ہے۔ اِس سے مراد مسیح ابن مریم نہیں۔ بلکہ کوئی اور انسان ہے۔ لیکن جو الفاظ یوحنّا اصطباغی نے کہے وہ تو صحیح تھے۔ ہاں وہ اپنے خاص معنے رکھتے تھے۔ اِن الفاظ کے معارف سے آگاہ ہونے کے لیئے ہمیں یہ کبھی نہ بھولنا چاہئیے۔ کہ جن لوگوں کو مخاطب کر کے یہ الفاظ کہے گئے وہ نہایت ادنیٰ درجہ کی سمجھ اور عقل رکھتے تھے۔ دراصل اُن کے قوائے عقلیہ اپنے اندر طفولیت کا رنگ رکھتے تھے۔ جناب مسیح جو اکثر تمثیلوں میں گفتگو کیا کرتے تھے۔ تو اِس کی وجہ

بھی یہ ہی تھی کہ ان کے حواری نہایت ہی موٹی عقل کے تھے۔ جو کسی مسئلہ کو بغیر تشریح و تمثیل نہ سمجھ سکتے تھے۔ دنیا کے دُوسرے حصوں میں بھی معلّمان مذہب کو بھی دقّت پیش آئی ہے۔ کم فہموں کو مذہب کی باتیں سمجھانے کے لیئے اکثر انھیں تمثیل استعارہ اور تشبیہ سے کام لینا پڑا ٭

سمبلزم* اور انسانی ابتدائی سوسائٹی

اِنسانی سوسائٹی جب ابتدائی منازل میں تھی۔ تو انسان ایسے وقت بعض حقائق پر سادے الفاظ میں آشنا نہ ہوسکتا تھا۔ اِس لیئے بعض وقت بعض اُمورات کے سمجھانے کے لیئے کوئی نہ کوئی نشان یا تصویر اختیار کی جاتی تھی۔ جس طرح گڑیاں بچّوں کی تفریح کا موجب ہو جاتی ہیں۔ اِس طرح بقول جناب کرشن انسان کے سامنے جب اِس کی عقل ایک بچّہ کی سی عقل تھی۔ خدا کے قایم مقام بتوں کو رکھا جاتا تھا۔ لیکن میں کہتا ہوں کہ ہم تو اُس زمانہ سے تعلّق نہیں رکھتے۔ ہمارے قوائے عقلیہ تو اس وقت نشو و نما یافتہ ہیں ہم تو ان نشانوں یا تصویروں کے محتاج نہیں۔ ہمارے سامنے تو حقیقت اپنی اصل شکل میں پیش ہونی چاہیئے۔ اگر زمانہ کے لوگ پرانے مذاہب کو سمجھنے میں اس حقیقت کو اپنے سامنے رکھتے تو کسی مذہب کی اصل حقیقت کو سمجھنے کے لئے کسی دقّت پیش

---

* معبود کی جگہ کوئی قایم مقام تصویر یا نشان رکھ کر اس نشان کی عزّت یا پرستش کرنا اسکا نام سمبلزم ہے۔ ایسا ہی مذہبی رسوم میں بعض اشیاء کو بعض اعمال یا عقاید کا قائم مقام بنانا بھی سمبلزم کہلاتا ہے ٭

پڑتے۔ کچھ سمجھ نہیں آتی کہ اس زمانہ میں بھی لوگ ایک طرف تو معقولیت کے بادشاہ بن بیٹھتے ہیں اور دوسرے ہر معاملہ زندگی میں بھی فی الواقعہ ایسے ہی ہیں۔ لیکن جب مذہبی معاملہ اُن کے سامنے آجاتا ہے تو عقل چھوڑ فہم عامہ سے بھی کام نہیں لیتے۔ وُہ اپنے مذہب کے کسی قسم کے نشان اور تصاویر کو پاتے ہیں تو اُن کو وُہ حقیقت پر محمول کر لیتے ہیں۔ وہ استعاروں کو اصلیت اور تشبیہ کو حقیقت قرار دیتے ہیں۔ یہی حالت رسم بپتسمہ کے متعلق ہے۔ یہودیوں میں بچے کے ایک خاص عمر تک پہنچنے پر یہ رسم ادا کی جاتی تھی۔ اِس عمر تک شریعت کی پابندی بچے کے ذمہ نہ تھی۔ گویا صغرسنی غلطیوں کی پردہ پوش تھی۔ لیکن کسی کو بپتسمہ دے دیا جاتا تھا۔ تو اُس کا فرض ہو جاتا تھا۔ کہ وُہ شرعی احکام کو بجالائے۔ ہر ایک قسم کی نجاستوں اور ناپاکیوں کو جسم کے کپڑوں سے دور کرنے کے لیئے ہم پانی کا استعمال کرتے ہیں۔ اِسی طرح ایک یہودی بچہ کو خاص عمر کے ہونے پر بپتسمہ کے وقت تالاب میں غوطہ دیا جاتا تھا۔ اور اس میں اشارہ یہ تھا۔ کہ اس کو ہر قسم کی رُوحانی یا اخلاقی ناپاکیوں سے پاک کیا گیا ہے اور اِس طرح وہ ایک نئی زندگی کے لیئے تیار ہوا۔ یہ نئی زندگی کا خیال یا رسم جو آج عیسائیوں نے بھی یہودیوں سے لے رکھی ہے۔ کوئی یہودیوں سے ہی مختص نہیں۔ بلکہ ہندو اور آتش پرست بھی آج تک ایک نہ ایک قسم کی رسم ادا کرتے ہیں۔ ایک ہندو بچے کے متعلق بھی جب وہ ایک خاص عمر کو پہنچتا ہے رسم منڈن کی جاتی ہے یعنی اُسکے بال اتارے جاتے ہیں اور اسے دریا میں غسل دیا جاتا ہے۔ پھر رسم جنیو ادا ہوتی ہے۔

یہ جنیؤ گویا نئی زندگی کا نشان ہوتا۔ جیسا کہ بپتسمہ یہودیوں اور عیسائیوں میں اور
صلیب کا پہننا بعض عیسائی فرقوں میں +
سمبلزم کسی چیز کو معبود یا قابل عزت وجود کا قائم مقام ٹھہرا کر اس قائم مقام
کی عزت یا پرستش کرنا) بالضرور نسل انسانی کی اس حالت کے مناسب حال ہے
جیسا کہ پہلے ابھی کہا ہے۔ جب انسانی قواد عقلیہ ابتدائی حالت میں ہوتے ہیں۔ لیکن سمبلزم
سے نقصانات بھی بڑے بڑے واقع ہوئے ہیں۔ یہی نشانات حقیقت کے قائم مقام ہو
جاتے ہیں اور اس سے طرح طرح کے غلط عقیدے پیدا ہوتے ہیں۔ بپتسمہ بھی اس قسم کے
غلط نتائج کا موجب ہوا۔ یہ تو ایک نئی زندگی کی علامت تھی۔ جس میں مذہبی ذمہ داری
کسی شخص پر عاید ہوتی تھیں لیکن آج عیسائیوں کا ایک کثیر گروہ یہ ایمان رکھتا ہے کہ
بپتسمہ ہوتے ہی ایک معجزنما تبدیلی انسان میں پیدا ہو جاتی ہے۔ اسکی روحانیت بدل
جاتی ہے اور وہ بدی سے محفوظ ہو کر نیکوکار ہو جاتا ہے۔ بعض عیسائیوں کے نزدیک جب
کوئی بپتسمہ کی غرض سے پانی میں کودتا ہے۔ اور مسیح کے نام پر بپتسمہ پاتا ہے تو وہ فی الفور
معصوم ہو جاتا ہے۔ یہاں تک کہ اسے شریعت کی بھی ضرورت نہیں رہتی۔ بعض تو اس
بپتسمہ کی تاثیر کے اس قدر قایل ہیں کہ اگر مسیح کے نام پر بپتسمہ پانے کے بعد کسی سے کوئی
غلط کاری بھی ہو جائے تو بھی بپتسمہ کا اثر زایل نہیں ہو سکتا۔ یعنی جب ایک دفعہ
بپتسمہ پا لیا۔ پھر انسان نجات کا مالک ہو گیا۔ اس طرح وہ چیز جو بطور قائم مقام یا نشان کے
تھی۔ آخر کار حقیقت ہو گئی۔ بہر حال ان جہالتوں کا زمانہ گذر گیا۔ اگرچہ پادری لوگ

مشرقی ممالک میں جاکر اب بھی یہی تعلیم دیتے ہیں۔ وہ وہاں جاکر لوگوں کو خوفِ دوزخ سے ڈراتے ہیں۔ اُن کو یقین دلاتے ہیں کہ بپتسمہ کے پانی سے ہی وہ آگ ٹھنڈی ہو سکتی ہے۔ یہی اُن کا مایۂ ناز ہے۔ یہی وجہ ہے انھیں جو کامیابی ہوتی ہے وہ جہلاء میں ہوتی ہے۔ کیونکہ حقائق نہیں آخر نشان ہی ہوتے ہیں۔ ان سے کوئی روشنی یا علم تو کسی کو حاصل نہیں ہوتا۔ ان کا اثر ہمارے قلوب پر اسی وقت تک ہوتا ہے۔ جب ہم توہمات کا شکار ہوتے ہیں۔ علم وعقل کے آجانے پر ان باتوں کو چھوڑنا ہی پڑتا ہے۔ کیونکہ اس وقت کسی چیز کے آثار یا نشان نہیں بلکہ حقائق ہی ہمیں تشفی دے سکتے ہیں ✣

اسلام جو خدا کے مذہب کی آخری اور مکمل صورت ہے۔ ایسے وقت ظہور پذیر ہوا جب انسانی عقل کے کمال کا زمانہ شروع ہونے کو تھا۔ اس لیئے اسلام نے کل اپنی تعلیم کو معقولات پر رکھا۔ مذہب نے جو اس وقت تک رسمیات کا لباس پہنے ہوئے تھا۔ اسلام نے اسے اپنی اصلی شکل میں دنیا پر ظاہر کیا۔ حقائق مذہب کو سمجھانے کے لیئے جو باتیں متقدمین نے بطور نشان و آثار اختیار کر رکھی تھیں۔ ان کو برطرف کر کے اصل کی حقیقت سے انسان کو آگاہ کر دیا۔ اور ربانی تعلیم میں جن باتوں کو اس وقت تک رازِ سربستہ سمجھا جاتا تھا۔ اُن کو روز روشن کی طرح بین کر دیا۔ لفظ بپتسمہ کے بالمقابل جو لفظ عربی زبان میں ہے وہ صبغہ ہے۔ اس لفظ کے معنے کسی چیز کو رنگ میں غوطہ دینے کے ہیں قرآن نے اسلام کا نام صبغۃ اللہ یعنی خدا کا رنگ رکھا ہے بپتسمہ کی

جگہ لفظ صبغۃ اللہ استعمال کرکے قرآن نے حقیقت بپتسمہ کو شرح کردیا جب ہم کوئی چیز کسی رنگ میں ڈبوتے ہیں۔ تو وہ چیز اپنے اصلی رنگ کو چھوڑ کر اس رنگ کو اختیار کرلیتی ہے جس میں کہ وہ ڈبوئی جاتی ہے بپتسمہ کی غرض بھی یہی ہے یعنی خدا کی ذات سے متحد ہو جانا۔ اس روحانی حالت تک ہم نہیں پہنچ سکتے۔ جب تک ہم اپنی ہستی کو خدا کی ہستی میں فنا نہ کردیں یعنی اپنا رنگ چھوڑ کر خدا کے رنگ میں رنگین نہ ہو جاویں۔ یوحنا اصطباغی نے اسی مقام فنا کی طرف اشارہ کیا تھا جب اس نے یہ کہا کہ آنے والا آگ سے بپتسمہ دیگا۔ جب کوئی چیز آگ میں ڈالی جاتی ہے۔ تو اپنی شکل اور ہیئت کو چھوڑ کر آگ کی شکل و خواص کو اختیار کرلیتی ہے۔ ربانی بپتسمہ کیا ہے۔ آگ میں کود پڑنا اور اپنی ہستی کو چھوڑ کر ایک بے جان کی طرح خدا کے ہاتھ میں چلے جانا۔ نہ کوئی ذاتی خواہش نہ کوئی ارادہ بلکہ کامل عبودیت اور اطاعت کے ساتھ انقطاع الی اللہ اختیار کرلینا اور کامل اتباع کے ساتھ اپنی گردن کو خدا کے احکام کے آگے جھکا دینا۔ یہی حقیقت اسلام ہے۔ نہیں۔ بلکہ اسلام کے لفظی معنے یہی ہیں۔ لہذا قرآن کا یہ کہنا کہ اسلام ہی صبغۃ اللہ یعنی خدا کا بپتسمہ ہے۔ کس قدر صحیح ہے۔ جس بپتسمہ کی طرف یوحنا اصطباغی نے اشارہ کیا وہ اسلام ہی تھا۔

توبہ کے لئے پانی کا بپتسمہ

یوحنا نے بالکل صحیح کہا تھا کہ میں توبہ کرانے کے لئے پانی کا بپتسمہ دیتا ہوں لیکن کسی

کپڑے پر آپ اگر پُورا رنگ دینا چاہیں تو وُہ کپڑا پُورا رنگ اختیار نہیں کرے گا۔ جبتک کہ ہر قسم کے دھبّوں سے پاک صاف نہ ہو جائے۔ کسی کپڑے کو رنگ میں غوطہ دینے سے پہلے اگر اس پر دھبّے ہوں تو ہم اس کو پانی سے دھو لیتے ہیں۔ سو یُوحنّا نے تو یہی کہا تھا کہ پیشتر ازیں کہ تمھیں آگ یا خدا کے رنگ (صبغۃ اللہ) میں غوطہ دیا جاوے ضروری ہے کہ تمہاری روحانیت کی چادر کہ جس پر طرح طرح کے دھبّے ہیں۔ پہلے توبہ کے پانی سے دھو دیا جاوے۔ اب کلیسیا نے عملاً اس بات کو ثابت کر دیا ہے۔ کہ وہ ربّانی بپتسمہ نہیں دیتے۔ بلکہ اس بپتسمہ کے لیئے تیاری کر رہے ہیں۔ کیونکہ آج تک کلیسیا اپنے مریدین کو پانی کے ساتھ بپتسمہ دیتے ہیں۔ کیونکہ یہ امر آخر ایک حقیقت کا قائمقام ہے۔ پانی کا بپتسمہ تو صرف روحانی چادر کو دھو کر الٰہی رنگ میں رنگنے کی تیاری ہے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ کس طرح ممکن ہے۔ وُہ ربّانی آگ کس جگہ ہے جو ہماری نفسانیت کو بھسم کر کے اپنے خواص ہمارے اندر پیدا کر دے ✦

اس سوال کا جواب دینے کے لیئے سب سے پہلے ہم کو یہ دیکھنا ہے کہ ہم کیا چیز ہیں تاکہ اس چیز کو الٰہی آگ میں ڈال کر بھسم کر دیا جائے۔ ہم کوئی گوشت پوست نہیں جس سے ہماری انسانیت وابستہ ہے۔ بلکہ وُہ چیز جس کا نام **میں** ہے وہ ہماری مرضی۔ ہمارا ارادہ اور ہمارا محاکمہ و قوّت تمیز ہے۔ یہی وُہ چیز ہے جس کے ہونے سے انسان انسان کہلاتا ہے۔ یہی ایک چیز ہے جو انسان کو باقی کل کائنات سے ممتاز کرتی ہے جب ہم اپنی رائے کو دُوسری رائے کے ماتحت کر دیتے ہیں۔ تو ہم اپنی ہستی کو فناء

کر دیتے ہیں۔ اپنی رائے کو کھو کر دوسرے کی رائے کے ماتحت ہونا آگ میں کود کر اپنی ہستی کو گنوا
سے کچھ کم مشکل نہیں۔ لہذا آگ کے ساتھ بپتسمہ پانے سے مراد یہ ہی ہے کہ اپنی مرضی کو
خدا کی مرضی کے لیئے فنا کر دیں اور اس کا نام اسلام ہے یہی وہ بات ہے۔ جو قرآن
نے کہی۔ صبغۃ اللہ ومن احسن من اللہ صبغۃ ونحن لہ عٰبدون ۝
اسلام ہی خدا کا بپتسمہ ہے اور خدا کے بپتسمہ سے بہتر اور کونسا بپتسمہ ہو سکتا ہے اور
ہم تو اُسی کے تابع ہیں +

پانی کا بپتسمہ در اصل آگ کے بپتسمہ پانے کی ایک تیاری ہے۔ اب اگر وہ رسم تو بچہ کی
پیدا ہونے پر عیسائی گرجاؤں میں ادا ہوتی ہے۔ اور پھر اُس کو سن بلوغ پر دہرایا جاتا ہے
اگر اس میں وُہ کامل اطاعت مرضات اللہ اور انقطاع الی اللہ پیدا کر دیتی ہے۔
تو ہم تسلیم کر لیتے ہیں کہ پانی کا بپتسمہ ہی آگ کا بپتسمہ ہے۔ لیکن ہمارا تجربہ تو اسکے
برخلاف ہے۔ ان تمام رسموں کے ہوتے ہوئے بھی ہم نے وہ حقیقی عیسائی زندگی کالعدم
ہی دیکھی +

کہ دنیا میں ہر جگہ انسان خود رائے واقعہ ہؤا ہے۔ ہماری قوت ارادی تہذیب اور
تعدیل کی محتاج ہے۔ اس کے علاوہ اگر رضائے الٰہی کا ہمیں علم ہی نہ ہو۔ تو ہم کس
رضائے الٰہی کے ماتحت اپنی مرضی کو کریں۔ ہر مرحلہ زندگی پر ہمیں کسی نہ کسی رنگ
میں اپنی قوت تمیز سے اور ارادہ سے کام لینا ہے۔ اب اگر ہمارے سامنے دو راستے
کھلے موجود نہ ہوں۔ ایک وُہ رستہ جو ہماری مرضی نے تجویز کیا ہے۔ اور ایک وہ

راستہ جو خدا کی رضا پر بنایا گیا ہے تو کس طرح ہم اپنی رضا کو خدا کی رضا کے ماتحت کر سکتے ہیں۔ پولوس کس قدر کوتہ اندیش تھا۔ جب اس نے شریعت ربانی کی پیروی کو بیکار سمجھا۔ حالانکہ اطاعت شریعت ہی۔ وہ ایک راستہ تھا۔ جس پر چل کر ہم اپنی نفسانیت کو فنا کرنے کے لیئے خدا کے مذبح تک پہنچا سکتے ہیں۔ شریعت پر چلکر ہی ہم الٰہی آگ میں بھسم ہو سکتے ہیں ٭

عیسائیت اور اسلام میں قول فیصل۔

اس امر کے طے کرنے کے لیئے۔ کہ اسلام اور عیسائیت میں سے صداقت کس کے ساتھ ہے۔ اس سوال پر غور کرنا کافی ہے کہ کیا مسیح کے نام پر بپتسمہ پا لینے اور صلیب پر ایمان لانے سے ہم میں وہ معجزنما تبدیلی پیدا ہو جاتی ہے۔ کہ جس کے ماتحت ہم خدا کے ساتھ متحد ہو جاتے ہیں۔ کیا یہ ایمان ہمارا ہمارے تمام بہیمی جذبات و خواہشات کو مٹا کر ہم کو ایک مردہ کی طرح خدا کے ہاتھ میں رکھ دیتا ہے۔ اور ہم اسیطرح چلتے ہیں جس طرح وہ چلاتا ہے۔ اگر تو ایسا ہو جاتا تو فی الواقع مسیح کے نام پر پانی سے بپتسمہ پانا ہی آگ کا وہ بپتسمہ ہوتا جسکی طرف یوحنّا نے اشارہ کیا۔ لیکن اس رضا و تسلیم کی منزل (اسلام) پر پہنچنے کے لیئے اگر ہمیں تربیت و تعدیل کی ضرورت ابھی ہے اگر ہم ابھی اس بات کے محتاج ہیں۔ کہ ہم ہر روز ایک سبق حاصل کر کے اور ایک راستہ پر چل کر اس جنگ میں جو ہماری مرضی اور خدا کی مرضی کے درمیان ہوتا ہے۔ خدا کی مرضی کو غالب کریں اور اس طرح اپنی تمام خواہشات کو خدا کی رضا کے ماتحت لانے کے لیئے اگر ہمیں

ابھی ضرورت ہے کہ ہمارے ہاتھ میں کوئی ضابطہ دقانون ہو۔ تو پھر جو کچھ پولوس نے اپنے خط بنام رومیوں میں لکھا ہے۔ وُہ سب غلط اور بیہودہ ہے۔ اور اس کے مقابل جو کچھ جناب مسیحؑ نے تعلیم دی ہے۔ اسی میں اُنھوں نے زبّانی رسالت کا حق ادا کیا ہے

جناب مسیحؑ فرماتے ہیں +

"پس جو کوئی ان حکموں میں سے سب سے چھوٹے کو ٹال دیوے۔ اور ویسا ہی آدمیوں کو سکھا دے۔ آسمان کی بادشاہت میں سب سے چھوٹا کہلائے گا۔ پر جو کہ عمل کرے اور سکھلاوے ۔ وہی آسمان کی بادشاہت میں بڑا کہلاتے گا"+

(متی باب ۵۔ آیت ۱۹)

اب یہ تعلیم مسیح کیا ہے۔ خالصاً اسلام۔ وہی قوانین واطاعت کی انجیل لیکن بدقسمتی سے اس کی تعلیم کی تحریف پولوس کے ہاتھ سے شروع ہوئی۔ اور اس تحریف کی تکمیل مقام نائیسینؔ کی کونسل نے کی محمدؐ (علیہ الصّلوٰۃ والسّلام) ہی وہ تسلّی دھندہ تھے جنھوں نے ہر ایک حق کی بات سکھائی۔ اور جن کا ذکر یوحنا بابؔ۱۶ آیت ۷ اور ۸ میں ہے۔ اُنھوں نے خدا کا دین اپنی اصلی شکل وصورت میں تعلیم کیا +

اپنے تمام جذبات اور خواہشات پر موت وارد کرنا ہی آگ کا بپتسمہ پانا ہے۔ اگر ہم ایسا کرنے میں کامیاب ہو جاویں تو ہم میں اخلاق الٰہی پیدا ہو جاویں گے۔ یہی رُوح القدس کا بپتسمہ ہے۔ اور اسی کی طرف حدیث تخلقوا باخلاق اللہ اشارہ کر رہی ہے۔ لوہے کی طرح آگ میں داخل ہو کر ہم اپنے خواص اور رنگ کو چھوڑ کر آگ کے رنگ اور خواص اختیار کر لیتے ہیں۔ آگ کی طرح ہم میں سے آگ نکلنی ہے۔

اور آگ کے سارے افعال ہم سے سرزد ہوتے ہیں۔ ربّانی آگ میں پڑ کر اور اپنی نفسانیّت کو جلا کر جب ہم اس مقام کو پہنچ جاتے ہیں۔ تو پھر ہمارے ہاتھ خدا کے ہاتھ ہماری آنکھ خدا کی آنکھ اور ہمارے پاؤں خدا کے پاؤں ہو جاتے ہیں۔ یہ وہ مقام ہے کہ جہاں انسان سے خوارق اور کرامات سرزد ہوتی ہیں۔ اگر عیسائیت اپنے پیروں کو اس بلند مقام پر پہنچا دیا ہے۔ تو صلیبی بپتسمہ ہی رُوح القدس اور آگ کا بپتسمہ ہے لیکن اگر یہ باتیں عیسائی تاریخ سے محو ہو چکی ہیں اور وُہ پرانی روایات جو پہلی دُوسری صدی عیسائیت میں تھیں آج قصّہ و کہانی ہو چکی ہیں۔ تو پھر جس بپتسمہ کی طرف یوحنّا نے اشارہ کیا وہ بپتسمہ اسلام ہے +

الہام ایک فیضِ رُبوبیّت ہے

ہندوستان میں ایک فرقہ برہمو سماج ہے۔ جو خارجی الہام کے قائل نہیں یعنی اُن کا مذہب یہ ہے کہ کوئی تعلیم خدا کی طرف سے خارجی طریق پر نازل نہیں ہوئی بلکہ انسان کی قلبی ماہیت ہے۔ جو اندر ترقی پاکر الٰہی تعلیم کو پا لیتی ہے۔ انھیں کے ہم خیال ایک فرقہ یورپ میں بھی ہے۔ جن کو کہتے ہیں اس خطبہ میں دراصل وہی لوگ مخاطب ہیں۔ اور یہ خطبہ انہی لوگوں کی تحریک پر ۲۳۔ مئی ۱۹۱۴ء کو ووکنگ مسجد میں پڑھا گیا۔ یہاں ہم ترجمہ

ہیں ۔ تا سمنت سماج کی جگہ برہمو سماجی لکھیں گے +

برہمو سماجی اور کتب الہامی

ہماری زندگی خدا کی بنائی ہوئی چیزوں پر ہے ۔ اگر یہ نہ ہوتی تو ہم ہلاکت کا مُنہہ دیکھتے ہم سوا ان کے جی سکتے ہی نہیں ۔ ہم کھاتے ہیں پیتے ہیں ۔ ہم سانس لیتے ہیں ۔ لیکن ان تینوں ضروریات کا دفعیہ ایسی چیزوں سے ہوتا ہے ۔ جن کا وجود ہم میں نہیں بلکہ ہم سے خارج ہے ۔ ہم میں جاننے سوچنے اور احساس کرنے کی طاقت ہے لیکن یہ تینوں طاقتیں کام کرنے کے لیئے اشیاء خارجی سے نہ کہ اندرونی اشیاء سے تحریک پاتی ہیں ۔ ہم میں مختلف جذبات اور خواہشات ہیں ہمیں طرح طرح کے تقاضے لاحق ہیں لیکن ان تمام تقاضوں اور خواہشات کی تسکین خارجی اشیاء ہی کرتی ہیں ۔ المختصر ہمارے تمام خواص اور قوا کا نشو ونما اور قیام بیرونی چیزوں پر ہی ہے ۔ ہماری سب طاقتیں ہم میں چھپی رہتی ہیں ۔ جیسے پتھر میں آگ لیکن وہ چمک اُٹھتی ہیں ۔ جبکہ باہر سے کوئی چقماق انھیں لگایا جاوے ۔ ہماری حالت ہو بہو زمین کی سی ہے ۔ جس میں سے انواع واقسام کی چیزیں اسی وقت نکلتی ہیں ۔ جب بارش باہر سے آوے ۔ ہم اعلےٰ سے اعلےٰ استعدادیں رکھتے ہیں ۔ اور ہماری ترقی لامحدود ہے اور یہ وہ صداقت ہے جو سب سے پہلے اسلام نے سکھائی لیکن جو کچھ بھی ہم میں ہے ۔ وُہ ظہور پذیر نہیں ہوتا ۔ اور چھپا رہتا ہے ۔ جب تک کہ کوئی خارج سے چیز آکر اسے تحریک اور امداد نہ دے ۔ کیا انسان کا قلب اخلاق

فاضلہ اور رُوحانیات کا ایک بیش بہا خزانہ نہیں۔ خزانہ ضرور ہے لیکن مقفّل جس کی کلید باہر سے آئے گی۔ کیا ہمارا قلب نورالہی کو اپنے اندر لیئے ہوئے نہیں لیکن اس نُور کو مشتعل کرنیوالی چیز اندر نہیں باہر ہے +

اب اگر انسان کے اندرونی جوہر شرافت کو الہام الٰہی سے ہی پرورش پاتا ہے تو پھر یہ اندرونی جوہر جس طرح برھمو سماجیوں نے سمجھ رکھا ہے کس طرح اندر ہی اندر سے نشو و نما پائے گا۔ جب تک کہ بیرُونی اور خارجی طور پر کوئی ربانی تحریک پیدا نہ ہو۔ برھمو لوگ صرف اس لیئے الہامی کتب کے منکر ہیں کہ اُن کے نزدیک الہام ایک اندرُونی تحریک ہے نہ کہ خارجی۔ لیکن کیا برھمو لوگ کسی انسانی قوّت۔ کسی استعداد۔ کسی حواس کسی جذبات کسی تقاضہ اِنسانی کو ہمیں دکھلا سکتے ہیں۔ کہ جو اپنی ترقی۔ اپنے ظہور اپنے نشو و نما پانے کے لئے کسی ایسی چیز کا محتاج نہ ہو۔ جس کا وجود خدائے تعالےٰ نے انسان سے خارج میں پیدا کر رکھا ہے +

ہمیں کوئی ایسی چیز نظر نہیں آتی تو پھر ان قوّتوں کی نشو و نما کے لیئے جو اِنسانی قلب سے تعلق رکھتی ہیں۔ کیوں یہ خیال کیا جاوے کہ ان کا محرّک خارجی نہیں اندرُونی ہے۔ کیونکہ قلب اِنسانی ہی الہام کا مورد اور رُوحانیات کا سرچشمہ ہے۔ اور یہ تو برھمو بھی مانتے ہیں۔ کہ انھیں قلبی کیفیات کے نشو و نما دینے کے لیئے الہام الٰہی آتا ہے لہذا جب ہر ایک طاقت انسانی کا محرّک اپنا وجود خارجی رکھتا ہے۔ تو کیوں قلبی قوتوں کا محرّک یعنی الہام خارج میں وجود نہیں رکھ سکتا۔ الہام کے متعلق یہ استثناء

رکھی جس کو قلب سے تعلق ہے ایک بے معنی چیز ہے۔ چنانچہ انہی دلائل پر جو ہم نے اوپر دیئے ہیں قرآن کریم نے نہایت ہی مختصر الفاظ میں سورہ نحل میں برھمو سماجی عقائد کی تردید کرتے ہوئے یہ فرمایا ہے۔ واللّٰہ اخرجکم من بطون امھٰتکم لا تعلمون شیئا وجعل لکم السمع والابصار والافئدۃ۔ النحل آیت ۷۸

اللہ تعالٰے تمھیں رحم مادر سے جب نکالتا ہے تو تمھیں کوئی علم نہیں ہوتا۔ لیکن وہ تمھیں قوت بصارت۔ قوت شنوائی اور دل دیتا ہے۔

کیا مختصر لیکن جامع دلیل الہام کے خارجی ہونے کی قرآن یہاں دے گیا ہے۔ قوت بصارت۔ شنوائی اور دل یہ ہی تین بڑے ذرائع ہیں جن سے انسان علم حاصل کرتا ہے اور اُس کو اپنا بنالیتا ہے۔ کچھ چیز خارج میں ہوتی ہے جس کو تمہاری آنکھیں دیکھتی ہیں اور کان سنتے ہیں۔ بیرونی چیزوں کے مقابل آکر تمہاری سماعت اور بصارت ترقی پاتی ہے۔ بلکہ یہ طاقتیں ہی ضائع ہوجاویں۔ اگر خارجی چیزیں ان کے استعمال کے لیئے ان کے مقابل نہ آئیں۔ ایک بچہ صحیح وسالم آنکھیں لے کر پیدا ہوتا ہے۔ لیکن پیدا ہوتے ہی اگر وہ چند دن روشنی نہ دیکھے تو وہ قوت بصارت ضائع کردے گا۔ اسی طرح گونگا وبہرہ ہوجاوے گا۔ اگر پیدا ہوتے ہی کچھ مدت تک وہ آواز نہ سُنے۔ اب سماعت و بصارت یہ ہی دو بڑے ذریعے علم کے تھے۔ یہ دونوں ضائع چلے جاویں گے۔ اگر ان دونوں طاقتوں کی نشوونما دینے کے لیئے خارج سے چیزیں نہ آئیں۔ اب انسانی قلب تو تمام انسانی قوا سے بڑھ چڑھ کر ہے۔ یہ ہی الہام کا مورد ہے پھر الہام الٰہی کیوں خارجی

نہ ہو۔ خدا کے اور عطیات کی طرح الہام الٰہی بھی انسان کا علم الٰہی بڑھانے اور اس کا ایمان خدا پر مضبوط کرنے کے لیئے نازل ہوتا ہے۔ یا بہ الفاظ دیگر الہام اُس رُوحانیت کو ابھارنے اور تر و تازہ رکھنے کے لیئے آتا ہے۔ جو ابتدا سے فطرت انسانی میں مرکوز ہے اس طرح الہام الٰہی ایک ربوبیت الٰہی ہے۔ پھر جب ربوبیت کی ساری چیزیں خارج میں ہوتی ہیں تو پھر الہام کا خارجی ہونا کونسا مستبعد امر ہے۔

بعض لوگ الہام کو خارجی تو مان لیتے ہیں۔ لیکن وہ ایک اور مصیبت میں پڑ جاتے ہیں۔ اُن کے نزدیک الہام الٰہی کا دروازہ کسی خاص کتاب کے بعد بند ہو گیا مثلاً کوئی کہتا ہے کہ وید کے بعد الہام الٰہی نازل نہیں ہو سکتا۔ دوسروں کے نزدیک توریت یا انجیل کے بعد الہام مسدود ہو گیا ہے۔ یہ تو بالکل ممکن ہے۔ اگر الہام الٰہی کو کسی کتاب ہدایت کی شکل میں نازل ہونا ہو تو کسی ایسی کتاب کے بعد جو ایکطرف تو مکمل ہو۔ اور دُوسری طرف اپنی اصلی شکل و صورت میں قائم رہ چکی ہو۔ الہام الٰہی کتاب اللہ کے رنگ میں بند ہو جاوے گا +

الہام قرآن کی ضرورت

ہم بہت چیزوں پر زندہ رہتے ہیں۔ جیسا ہمنے شروع میں کہا۔ اور ربوبیت الٰہی ہمیشہ ان چیزوں کو قائم رکھتی ہے۔ صحیفہ قدرت کو دیکھو۔ جب کبھی کوئی چیز ختم ہو جائے یا بگڑ جائے تو پھر اُس کی جگہ نئی چیز پیدا کر دیجاتی ہے یہی سلسلہ نظام قدرت میں چل رہا ہے۔ اسی پہ ہماری حیات و قیام ہے۔ آئے دن بارش آسمان سے اترتی ہے

بارش کی ضرورت سے کون انکار کرسکتا ہے۔ بارش کو ہی دیکھ لو جب آسمان سے اُترتی ہے تو اُس کا ایک حصّہ انسانی استعمال میں آجاتا ہے۔ کچھ حصّہ پہاڑوں کی کھوہ میں چلا جاتا ہے۔ اور ہمارے لیئے بے مصرف ہوجاتا ہے۔ بقیہ حصّہ بارش کا مختلف زمینی اشیاء کے ملجانے سے گندہ ہو جاتا ہے۔ لیکن اگلے سال ہی نئی بارش ہماری ضروریات کے دفعیہ کے لیئے آجاتی ہے۔ کیا یہی قانون قدرت نہیں ہر ایک چیز میں دائر و سائر نظر نہیں آتا۔ جن پر ہماری بقا و قیام منحصر ہے یعنی جب کوئی چیز ختم یا غائب یا خراب ہوجائے تو فی الفور دُوسری چیز آگئی۔ کیا عجیب بات ہے۔ کہ یہ قانون ہماری جسمانی پرورش کی متعلقہ چیزوں پر تو صحیح مانا جاوے۔ لیکن ہماری روحانی پرورش کے لیئے اس قانون کا اطلاق صحیح نہ سمجھا جاوے۔ الہام الٰہی آخر ہمارے روح کی پرورش کے لیئے ہی خدا کی طرف سے آیا ہے۔ اِسی الہام نے ہی کتب مقدّسہ کی شکل اختیار کی ہے۔ بارش کی طرح ہر ایک قوم اس سے متمتع ہوئی۔ بارش کی طرح اس کا ایک حصّہ استعمال میں آجاتا ہے۔ کچھ حصّہ بہ سبب ان زبانوں کے مرجانے یا استعمال میں نہ رہنے سے انسان کے مصرف کا نہیں رہتا۔ جن زبانوں میں وہ الہام نازل ہُوا تھا۔ اور کچھ حصّہ انسان کے ہاتھ کی آمیزش سے خراب ہوجاتا ہے۔ مثلاً بائیبل کا اصل مفقود ہے جو کچھ ہمارے ہاتھ میں ہے وہ ایک حد تک انسانی جعل و تحریف ہے۔ اور کچھ اس میں اصل بھی ملا ہُوا ہے۔ زرتشت اور ایسے ہی دیگر انبیاء کی کتابوں کا بھی یہی حال ہُوا۔ وید مقدّس کے متعلق یہ کہا جاتا ہے کہ اس میں کوئی تحریف و تبدیلی نہیں ہوئی۔

ممکن ہے ایسا ہی ہو۔ ہم اس دعوے کی تردید کی ضرورت نہیں سمجھتے۔ لیکن یہ وہ مقفل خزانہ ہے۔ جس کی کلید گم شدہ ہے۔ یہ الہام ایک ایسی زبان میں اس وقت پایا جاتا ہے جس کے سمجھنے سے حاملان الہام بھی قاصر ہیں۔ کہتے ہیں کہ تیس سال کی شبانہ روز محنت ایک انسان کو اس قابل کر سکتی ہے کہ وہ اس کی صداقتوں کو سمجھ سکے ہم یہ بھی کہہ گذرے کہ خدا ان لوگوں کی انہی صداقتوں کو پھر الہام کرنے کی طاقت نہ ہوتی کہتے ہیں۔ چند ہزار برس گذرے جب وید مقدس بعض رشیوں پر جو کوہ ہمالیہ میں رہتے تھے نازل ہوا۔ لیکن کیا اسی ہمالیہ پہاڑ پر ہر سال بارش نہیں ہوتی۔ بارش کے سوا تو چند مہینے بھی گذرنا مشکل ہے۔ بارش تو ہمیشہ آتی ہے۔ لیکن اکا بہت سا حصہ ان بڑی پہاڑوں کی وادیوں اور کھوہوں میں غائب ہو جاتا ہے۔ اب اگر کسی سال امساک باراں ہو۔ تو کیا وہاں کے رہنے والے شبانہ روز محنت کر کے آب بارش کو پہاڑوں کی کھوہ میں سے نکالیں۔ جہاں بظاہر ان کے ہاتھ نہیں پہنچتے یا نئی بارش کیلئے آسمان کی طرف دیکھیں۔ اوّل الذکر طریق تو نہایت نامعقول اور ناقابل تعمیل ہوگا۔ لیکن میں کہتا ہوں کہ کوہستانی ذخیروں سے پانی کو باہر کھود لانا زیادہ آسان ہے۔ بہ نسبت اس کے کہ ویدک صداقتوں کو اس کی زبان میں سے نکالا جاوے۔ جس کا سمجھنا قریب قریب ناممکن ہو گیا۔ وید کے علاوہ کوئی اور الہامی کتاب اصلی صورت میں قائم ہی نہیں رہی۔ اگر یہ تغیر و تحریف سے بچی رہتی۔ تو بے شک کسی نئے الہام کی ضرورت نہ ہوتی۔ لیکن یہ سب کی سب کتابیں جن میں

ویدھی شامل ہے۔ یا تو گم ہو گئی ہیں یا بگڑ گئی ہیں یا ناقابل فہم ہو گئی ہیں۔ ان پر بھی
تین فعل صادر ہو گئے۔ جو ہر سال آسمانی بارش پر وارد ہوتے ہیں۔ یعنی ایک حصہ بارش
کا استعمال میں آکر قایم نہ رہنا ایک کا پہاڑوں کی کھوہ میں جا کر مصرف کے قابل
نہ رہنا اور ایک کا خراب ہو جاتا۔ تو پھر جس طرح نئی بارش آتی ہے۔ کیوں نیا الہام
اس ضرورت کو آکر پورا نہ کرے۔ خدا کی آخری کتاب نے اپنے الہام کی ضرورت کو ثابت
کرنے کے لیئے کس خوبصورتی سے اس حقیقت کو کھولا + وما انزلنا علیک الکتب
الا لتبین لھم الذی اختلفوا فیہ وھدی ورحمۃ لقوم یومنون ○ واللہ
انزل من السماء ماء فاحیا بہ الارض بعد موتھا ان فی ذالک
لایۃ لقوم یسمعون ○ النحل آیت ۶۵ و ۶۴

ہم نے (اے محمدؐ) یہ کتاب جو تیری طرف نازل کی ہے .... وہ ماننے
والوں کے لیئے ایک ہدایت اور رحمت ہے۔ اور خدا تو ہمیشہ ہی بارش آسمان سے
بھیجتا ہے۔ جب کبھی (امساک بارش کے باعث) زمین مرجاتی ہے۔ پھر اللہ بارش
سے زمین کو زندہ کرتا ہے۔ سننے والے سُن لیں۔ اس میں ان کے لیئے ایک نشان ہے
اب اگر انسانی قلب پر الہام کا وہی اثر ہوتا ہے۔ جو بارش کا زمین پر۔ تو کون
نہیں جانتا۔ کہ قرآن کے نزول کے وقت ایک زبردست رُوحانی امساک چاروں
طرف تھا۔ کل کتب مقدسہ یا گم ہو چکی تھیں یا محرّف یا ناقابل فہم۔ اب اگر خدا اسلام
سے پہلے نسل انسانی پر اس قدر مہربان تھا۔ کہ وہ اپنے فضل سے انھیں الہام بھیجتا
رہا تو کیا ہم اس کی سوتیلی اولاد ہیں یا اس کی مخلوق نہیں۔ ہمیں کیوں وہ سڑی گلی

چیزوں پر چھوڑتا ہے۔ اگر قدیمی رشی بلا تکلیف کے اپنی مادری زبان میں وید مقدس کو آسانی سے سمجھ سکتے تھے تو ہم پر کیوں یہ مصیبت ڈالی جاتی ہے کہ ہم غوامض وید سمجھنے کے لیئے برسوں مصیبت میں ڈالے جاویں۔ قرآن خدا کی طرف سے آیا اور وقت پر آیا۔ ہاں اگر قرآن بھی معرض تغیر و تحریف میں آجاتا۔ تو بے شک قرآن کے بعد بھی کسی الہام کی ضرورت تھی۔ لیکن چونکہ قرآن اپنی اصل شکل و صورت میں آج تک قایم ہے۔ نئی کتاب ایک امر فضول ہے۔ صحیفۂ قدرت میں کوئی نئی چیز اس وقت پیدا کی جاتی ہے۔ جب تک کہ اس چیز پر اس کی پہلی شکل میں مذکورہ بالا تینوں حالتیں وارد نہ ہوگئی ہوں۔ یعنی ختم ہوجانا۔ بگڑجانا یا غایب ہوجانا۔

انسانی ہاتھ اور ربانی ہاتھ

ہم بھی اپنی زندگی میں کیسے ہی متلون الحال ہیں۔ ایک ہی بات کو ایک جگہ ہم نفرت سے دیکھتے ہیں اور دوسری جگہ اسے خوشی سے گوارا کر لیتے ہیں۔ آجکل سلیقہ شعار لوگ پسند نہیں کرتے کہ غذا کو انسانی ہاتھ لگے۔ حتیٰ کہ ہاتھ سے دوھے ہوئے گائے کے دودھ پر مشین کے ساتھ دوھے ہوئے دودھ کو ترجیح دیجاتی ہے خوراک بہم پہنچانے والے تاجروں کی دوکان پر بعض چیزوں پر یہ لکھا ہوا ہوتا ہے کہ اس چیز کی تیاری میں انسانی ہاتھ نہیں لگا۔ اور ہم بھی ایسی چیزوں کو بڑی خوشی سے خریدتے ہیں۔ بکٹریالوجی* یعنی علم جراثیم میں تو اور بھی اس امر کی اہمیت کو بڑھا دیا ہے کہ جو چیز استعمال میں آوے اس پر حتی الوسع انسانی ہاتھ کم لگے۔

*Bacteriology

چھری۔کانٹے۔ چمچے کے استعمال کی یہ ہی لم ہے۔ اِسی طرح مصنوعی
چیزوں پر قدرتی چیزوں کو ترجیح دی جاتی ہے۔ کیا مزہ کی بات ہے۔ کہ
ہر ایک امر جو ہماری زندگی سے تعلق رکھتا ہے۔ اس میں تو ہم یہ ہی
پسند کریں گے۔ کہ وہ حتی الوسع انسانی ہاتھ کے چھونے سے بچ
جاوے۔ لیکن مذہبی معاملے میں تو ہمیں کوئی گھبراہٹ نہیں ہوتی
کس طرح ایک شخص بائبل کی سی ایک ایسی کتاب پر راضی ہو سکتا ہے
جس کو آئے دن انسانی ہاتھ نے لگ لگ کر خراب کر دیا ہو +

آنحضرت صلعم خاتم النبیّن ہیں

دُنیا کی تمام مقدّس کتابیں ایک نہ ایک مقدّس اِنسان سے
تعلّق رکھتی ہیں۔ یہ کتابیں ان بہترین اِنسانوں کے ذریعہ دُنیا
میں آئیں۔ جن کو انبیاء کہتے ہیں۔ یہ لوگ خدا کی زبان تھے۔ بعض
صداقتوں کا انکشاف خدا کی طرف سے اُن پر ہوُا۔ اور اُنھوں
نے ان صداقتوں کو اپنے قول و فعل کے ذریعے مخلوقِ الٰہی پر
ظاہر کیا۔ ان کی زندگیاں کلام الٰہی کی ایک عملی تفسیر تھیں۔ اور یہ
کون نہیں جانتا۔ کہ تعلیم کے مقابل عمل بہتر نتائج پیدا کرتا ہے۔

دراصل سیکھنے والے کو اسی وقت کسی کی تعلیم سمجھ آتی ہے۔ جب سکھلانے والا اپنی تعلیم کو عملی جامہ پہنا دے۔ ہمیں اتنے الفاظ نہیں سمجھ آتے۔ جتنا کسی کا فعل اس کے الفاظ کی تشریح کر دیتا ہے اور اگر یہ امر نہ ہو تو پھر کسی انسان کے ذریعے خدا کا کتابوں کو نازل کرنا ایک بیہودہ.... فعل ہے۔ بارش جس طرح آسمان سے آتی ہے اسی طرح خدا تعالےٰ کتابیں بھی پھینک سکتا تھا۔ لیکن کتاب بغیر پیغمبر کے ایک مُردہ چیز ہے۔ نبی کے اپنے افعال و اعمال ہی خدا کے الہام کی ایک زندہ تشریح ہوتے ہیں۔ لیکن ایک نبی تو انہی لوگوں کو اپنے فعل سے سمجھا سکتا ہے۔ جو اس کے وقت اس کے پاس موجود ہوں۔ اور جب اس پر دو تین نسلیں گذر جاویں اور اُس کے دیکھنے والے یا اُس کو دیکھنے والوں کے دیکھنے والے نہ رہیں۔ تو پھر آنے والوں کے لیئے اس کا نمونہ قائم نہیں رہ سکتا۔ اگر اس کے افعال و اقوال تحریر میں محفوظ نہ ہو جاویں۔ ایک سابق نبی ہمارے لیئے نبی ہو ہی کیسے سکتا ہے۔ اگر اس کی باتیں ہم تک محفوظ نہ پہونچیں۔ جاؤ! کل دُنیا کے انبیاؤں کو دیکھو یہ بات اگر حاصل ہے تو صرف ایک محمد صلے اللہ علیہ وسلم کو آپ کے سوائے کسی نبی کے حالات محفوظ نہیں۔ حضرت

محمدؐ ہی انبیاء علیہ السلام میں سے ایک تاریخی انسان ہیں انبیاءؑ میں ہی نہیں۔ بلکہ کل مشاہیر دُنیا میں +

جولیس سیزر سکندر اعظم اور نپولین ہی تین ایسے مشاہیر گذرتے ہیں جو سب سے زیادہ تاریخی انسان ہیں لیکن یہ تینوں بھی محمدؐ عربی کے سامنے ہیچ ہیں۔ آپ کی زندگی کا ہر ایک پہلو ہمارے سامنے روشن و بین موجود ہے۔ بالمقابل مسیح موسیٰ یا دیگر انبیاء علیہ السلام کی زندگیاں ایک قسم کی لسنگی کے بادل کے تلے ہیں۔ محمدؐ تاب نصف النہار کی طرح اپنے تمام جلال و جمال سے افق دُنیا پر چمکتا ہوا نظر آتا ہے۔ قرآن کی کوئی آیت لیلو اس کتاب مقدس کا کوئی حکم۔ کوئی امر و نہی لیلو۔ اور تمہیں آنحضرت صلعم کی زندگی میں ان سب کی عملی تصویر ملیگی اور وہ بھی کتابوں میں محفوظ ہے۔ بالمقابل انسانی زندگی کا کوئی شعبہ تصور میں لے آؤ۔ تمہیں اس کا ایک نمونہ یا اسوہ آپکی زندگی میں نظر آجائیگا اور یہ سب باتیں احادیث میں موجود ہیں۔ مجھے یہ سمجھ نہیں آتی کہ جناب مسیح کیطرح نسل انسانی کے لیے ہادی بن سکتے ہیں۔ یا انکی زندگی ہمارے لیے کس طرح نمونہ ہوسکتی ہے۔ جب ہمیں ان کی زندگی کا کوئی علم ہی نہیں۔ انجیل کو ہاتھ میں لیلو اور جو کچھ ان کتابوں میں جناب مسیح کی پیدائش پیشگوئیوں معجزات کے متعلق لکھا ہے۔ ان حالات کو نکال دو۔ اور یہ وہ باتیں ہیں جنکا ہماری روزانہ زندگی سے کوئی تعلق نہیں۔ تو پھر انجیل میں جو کچھ رہ جاتا ہے وہ شاید دو باتیں تعلیموں

میں ختم ہو جاتا ہے۔ کیا اس قدر قلیل چیز ایک انسان کی نشیب و فراز زندگی کے لئے کسی قسم کی ہدایت یا نمونہ یا مشعل راہ ہو سکتی ہے۔ بالمقابل نبی عربی دیکھو۔ تو ہر ایک چیز اپنے کمال میں نظر آتی ہے۔ ہاں اور انبیاء علیہم السلام کی طرح اگر آپ کے نقش قدم بھی دھندلے اور ناقابل شناخت رہ جاتے تو پھر نسل انسانی معقول طور پر حق رکھتی تھی۔ کہ کسی اور نبی کا مطالبہ کرے۔ لیکن ایک تو آنحضرت صلعم ہی کی زندگی ایک انسان کی جامع مانع زندگی ہے۔ ساری نشیب و فراز زندگی انسانی اس میں آجاتے ہیں۔ اور پھر یہ سب کے سب محفوظ ہیں۔ اس لئے مطالبہ بالا کے لئے کوئی گنجائش نہیں۔ لہٰذا آنحضرت صلعم ہی خاتم النبیین ہیں۔ اور قرآن کریم ہی خدا کی آخری کتاب ہے۔ انسان کی یہ ضرورت کہ اس کے ہاتھ میں خدا کا کلام اپنی اصل شکل و صورت میں ہو۔ اور اس کے رسول کی زندگی آٹھ پہر اس کی آنکھ کے تلے رہے۔ اس ضرورت کو قرآن اور مورد قرآن نے کامل طور پر پورا کر دیا ⁂

ووکنگ مشن فنڈ بڑھانے کی ایک آسان تجویز

اسلامک ریویو کے گذشتہ سالہائے کے پرچوں کی قیمت میں ہم نے اس لئے رعایت کردی۔ ہے کہ ان کی قیمت کو ووکنگ مشن کے اخراجات پر لگایا جاوے۔ اسلامک ریویو کے پہلے چار سال کے پرچے اس لئے بھی خرید نے کے قابل ہیں کہ ان پرچوں نے سیاہ ظلمت اور شب یجور کی تاریکی میں بجلی کا کام کیا۔ ایسے وقت جب اسلام کے چہرہ پر افترا۔ غلط فہمی اور غلط بیانی کی سیاہ چادر پڑی ہوئی تھی۔ اسلامک ریویو نے اُس چادر کو پھاڑ اسلام کے منور چہرہ سے یورپین آنکھوں میں چکا چوند کردی۔ تفصیل قیمت مندرجہ ذیل ہے

جلد اول اسلامک ریویو سنہ ۱۹۱۳ء .. .. .. عا/ ۸
جلد دوم " " سنہ ۱۹۱۴ء .. .. .. عا/ ۸
جلد سوئم " " سنہ ۱۹۱۵ء .. .. .. ے/ ۸
جلد چہارم " " سنہ ۱۹۱۶ .. .. .. صہ/
جلد پنجم سنہ ۱۹۱۷ء .. .. .. عہ/

جلد رسالہ اشاعت اسلام جولائی سنہ ۱۹۱۴ء لغایت دسمبر سنہ ۱۹۱۶ چھ پرچے عمہ/

جلد اول " سنہ ۱۹۱۵ء عا/ ۸
جلد دوم " سنہ ۱۹۱۶ء ے/
جلد سوم " سنہ ۱۹۱۷ء ے/

پتہ ۹۰۰

منیجر اشاعت اسلام۔ عزیز منزل۔ نولکھا۔ لاہور